محمد آصف رضا

لیکچرار اردو، گورنمنٹ صادق ایجرٹن کالج، بہاول پور

ناول "ادھ ادھورے لوگ" میں مقامی شناخت کا المیہ

Muhammad Asif Raza

Lecturer Urdu, Govt Sadiq Egerton College, Bahawalpur

The Calamity of local Identity in Novel "Adh Adhooray Log"

ABSTRACT

Novel "Adh Adhooray Log" is written in the historical background of Bahawalpur State (former). Historical identity of the state has been spoiled under a conspiracy. Bahawalpur State was a prosperous state before partition. Being a Muslim state Bahawalpur joined Pakistan but this proved fatal for the state and its inhabitants. This novel portrait historical events and individuals with their psychological complications. After Jinah's death, people in power deprived Bahawalpur of its identity first and then provincial rights. Poverty, hunger, and inferiority complex became the fate of people of the state. This novel is the tragic story of such people. This research article intends to makes an analysis of the awareness produced by the novel's historical, cultural, and political dimensions in the context of Bahawalpur State.

Keywords: *Hafeez Khan, Adh Adhooray Log, Bahawalpur Prosperous State, Historical Novel, Tragic Story, Cultural and Political Novel.*

محمد حفیظ خان ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک انسان ہیں۔ انھوں نے قانون کی تعلیم حاصل کی اور مختلف تدریسی اداروں میں قانون کے استاد رہے، سول سروسز میں افسر رہے اور کئی سال منصف کی حیثیت سے خدمات بھی سر انجام دیں لیکن ان کی بنیادی پہچان ادیب کی ہے۔ ان کا نام عصر حاضر کے لکھنے والوں میں ایک معتبر حوالہ ہے۔ انھوں نے اردو اور سرائیکی زبانوں میں لکھا اور دونوں میں یکساں پذیرائی پائی۔ حفیظ خان نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا۔ آج وہ افسانہ نگار، ڈراما نگار، شاعر، محقق، نقاد، مترجم اور ایک بہترین کالم نگار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ حال ہی میں شائع ہونے والے ناول "ادھ ادھورے لوگ" نے ان کی تخلیقی جہتوں میں اضافہ کرتے ہوئے انھیں معاصر ناول نگاروں کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔ اس ناول کو ادبی حلقوں میں خوب پذیرائی ملی ہے۔

Article (2-1-3) Published on 22-05-2024

Tashkeel, Department of Urdu, University of Jhang, E mail: tashkeel@uoj.edu.pk

12KM, Chiniot Road, Jhang, Punjab, Pakistan. 047-7671240

یہ ناول پہلے پہل مارچ ۲۰۱۸ء کو سرائیکی زبان میں شائع ہوا، بعد ازاں نومبر ۲۰۱۸ء کو حفیظ خان نے بذاتِ خود اسے اُردو زبان میں منتقل کیا۔ ملتان کے ایک اشاعتی ادارے ملتان انسٹیوٹ آف پالیسی اینڈ ریسرچ کے ذریعے زیورِ طباعت سے آراستہ ہونے والا "ادھ ادھورے لوگ" مجموعی طور پر ۲۳۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ ناول کا مکانی دائرہ کار بہاول پور، احمد پور شرقیہ اور ڈیرہ نواب صاحب کا علاقہ ہے۔ ناول کا انتساب "خالد فتح محمد" کے نام ہے۔ یہ ناول ۳۷ ابواب میں منقسم ہے۔ ناول "ادھ ادھورے لوگ" اپنے اندر ریاست بہاول پور کی شکست و ریخت کی ایک تلخ تاریخ سموئے ہوئے ہے اور سابقہ ریاست بہاول پور کے تاریخی تناظر میں لکھا گیا ہے بقول ناول نگار یہ ناول فرضی کرداروں کے ذریعے حقیقی تاریخی تناظر میں لکھا گیا ہے۔(1)

بہاول پور کی سیاسی تاریخ جدوجہد، سعیِ عمل، جرات و بے باکی اور ایثار و قربانی کی تاریخ ہے۔ ریاست بہاول پور کی تاریخ ڈھائی سو سال سے زیادہ پرانی ہے۔ بہاول پور کے داؤد پوترہ حکمران اور سندھ کے کلہوڑا حکمران اپنے بارے میں حضور اکرمؐ کے چچا حضرت عباسؓ کی اولاد ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ۱۲۵۸ء میں ہلاکو خان کے ہاتھوں بغداد کی تباہی کے بعد عباسی خاندان نے اپنی ناموس بچانے کے لیے قاہرہ (مصر) میں پناہ لے لی۔ اس کے بعد اس خاندان میں سے کچھ لوگ سندھ وارد ہوئے۔ امیر صادق خان اوّل وہ پہلے شخص تھے جو خاندانی کشمکش سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے ۲۷۔۱۷۲۶ میں سندھ کو خیر باد کہہ کر مخدوم شیخ عبدالقادر کی دعوت پر اوچ آ گئے۔

> "مخدوم صاحب کی سفارش پر مغل گورنر حیات اللہ خان نے امیر صادق محمد خان اوّل کو ۱۷۲۷ء میں چودری کا علاقہ بطور جاگیر دے دیا۔"(2)

امیر صادق محمد خان اوّل کے بعد ان کے ولی عہد امیر محمد بہاول خان اوّل تخت نشین ہوئے۔ ان کی مدت حکمرانی اگرچہ صرف تین سال رہی لیکن اس کے دورِ حکومت کا سب سے بڑا کارنامہ بہاول پور شہر کی تعمیر ہے۔ ریاست بہاول پور کا اصل بانی بھی نواب بہاول خان اوّل کو ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔ امیر محمد بہاول خان اوّل کو ایک ایسے مقام کی اشد ضرورت تھی جسے وہ اپنا باقاعدہ دارالحکومت قرار دیں اور جہاں سے وہ اپنے مقبوضات کا انتظام و انصرام خوش اسلوبی کے ساتھ کر سکیں۔ اس مقصد کے لیے جھوک سوڈھا نامی بستی کا انتخاب کیا گیا اور اس طرح بہاول پور شہر کا قیام عمل میں آیا:

> "اس کے ساتھ ہی ۱۷۴۸ء نواب بہاول خان اوّل نے اسے "دارالسرور بہاول پور" کے نام سے اپنے صدر مقام کے لیے منتخب کیا۔"(3)

ریاست بہاول پور تقریباً ڈھائی سو سال کا عرصہ گزار کر اپنے اختتام کو پہنچی۔ جو سلسلہ نواب صادق خان اوّل سے شروع ہوا وہ نواب صادق خان خامس پر ختم ہو گیا جو ریاست کے بارہویں اور آخری نواب ثابت ہوئے اور

یوں نواب اور ریاست دونوں وقت کی گرداب میں کہیں گم ہو کر رہ گئے۔ حفیظ خان نے اس ناول میں ریاست بہاول پور کے تاریخی حالات کو بیان کیا ہے کہ ریاست بہاول پور ریاست سے صوبہ اور صوبے سے ڈویژن میں کس طرح تبدیل ہوئی اور اس کے زوال میں کون سے عوامل کار فرما رہے۔ اس ناول کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا حصہ تقسیم اور قیام پاکستان سے قبل کا ہے جب کہ دوسرا حصہ تقسیم اور قیام پاکستان کے بعد کے حالات پر مبنی ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ اس ناول کا بنیادی موضوع ریاست بہاول پور (مابعد تقسیم) کی تاریخی، سیاسی، اور سماجی صورت حال ہے لیکن اس کے علاوہ ناول نگار نے ان مسائل کو بھی ناول کے موضوعات میں جگہ دی ہے جن کا سامنا بنی نوع انسان کو ہر عہد میں رہا ہے وہی نفس پرستی، ہوسِ زر، استحصال، انسان دشمنی، طبقاتی تقسیم، مذہبی شدت پسندی اور حقوق نسواں کی پامالی وغیرہ۔

تقسیم ہندوستان ایک ایسا بڑا سانحہ تھا۔ جس نے پورے خطے (برصغیر) کے لوگوں کو متاثر کیا اور اس سانحے کے ضمن میں تقریباً ہر خطے کے لوگوں نے لکھا اور ابھی تک لکھا جا رہا ہے۔ اُردو ادب ایسے کئی افسانوں، ناولوں اور تحریروں سے بھرا ہوا ہے۔ جس میں اس تجربے کا بھرپور اظہار ملتا ہے۔ (سابقہ ریاست) بہاول پور کا خطہ بھی ایک ایسا خطہ ہے جو باقی خطوں کی طرح تقسیم کے اس عمل اور اس سے پیدا ہونے والے مسائل سے متاثر ہوا۔ تاہم اُردو ادب میں اس موضوع پر زیادہ کام دیکھنے کو نہیں ملتا اگر ہے بھی تو کمیاب۔ ایسے میں محمد حفیظ خان کا یہ ناول "ادھ ادھورے لوگ" بہاول پور کے رہنے والوں کی داستانِ حیات بھی ہے اور داستانِ غم بھی۔

یہ ناول ریاست بہاول پور میں جنم لینے والے فیاض حسین جیسے ان بد قسمت کرداروں کی کہانی ہے جو اپنی غصب شدہ پہچان کی تلاش میں نکلتے ہیں اور خود بھی کہیں گمنام ہو کر مارے جاتے ہیں۔ فیاض اس ناول کا مرکزی کردار ہے جو حالات کا ڈسا ہوا، غموں کا مارا ہوا اور استحصال گزیدہ ہونے کے باوجود اپنے حقوق کی جدوجہد اور اپنی شناخت کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ ناول کی پوری کہانی فیاض حسین کے گرد گھومتی ہے اور اس کی موت کے ساتھ فنا کا راستہ اختیار کرتی ہے۔ فیاض حسین ظلم کے نظام کے خلاف ڈٹ جانے کا ایک استعارہ ہے۔ وہ نواب صادق خان خامس کے دستے میں شامل ایک باڈی گارڈ کا بیٹا ہے جس کی خواہش ہے کہ اس کا دس جماعتیں پاس بیٹا فیاض بھی باڈی گارڈ بنے لیکن فیاض کا المیہ یہ ہے کہ کوئی کام اس کی طبیعت سے میل نہیں کھاتا۔ وہ ایک بے چین روح کا مالک ہے جو اپنی شناخت کے بحران میں مبتلا ہے لیکن ایک طویل عرصے بعد اسے محسوس ہوتا ہے کہ اس کی منزل وہ مطب ہے جہاں حکیم رام لعل بیٹھ کر لوگوں میں شفا بانٹتا ہے۔ چناں چہ وہ اپنے والد کی خواہش کے برعکس اس غیر مسلم حکیم رام لعل کی شاگردی اختیار کر لیتا ہے اور جلد چھوٹے حکیم کے نام سے مشہور ہو جاتا ہے۔ فیاض کی طبیعت میں اب ٹھہراؤ آ جاتا ہے لیکن یہ تادیر ثابت نہ ہوا۔ فیاض کی زندگی میں بہت سے نشیب و فراز آئے لیکن وہ کبھی پیچھے نہیں ہٹا۔ فیاض کی زندگی

میں سب سے بڑا رونما ہونے والا واقعہ تقسیم ہند کا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد فسادات کے ڈر سے حکیم رام اور اس کے گھر والے ہجرت کر کے بھارت چلے گئے اور جاتے جاتے اپنی ساری جائیداد فیاض کے نام کر گئے۔ اس جائیداد کو ہتھیانے کے لیے کئی گروہ تیار بیٹھے تھے جن میں احمد شاہ، وادھو، پیری بدمعاش، امام مسجد، اور خود فیاض کا چچا سر فہرست رہے لیکن ہر دفعہ فیاض کی موجودگی آڑے آتی رہی۔ فیاض اس جائیداد کی حفاظت کے لیے ڈٹا رہا یہاں تک کہ فیاض کے والدین بھی اس کے خلاف ہو گئے۔ فیاض سمجھتا تھا کہ یہ جائیداد اس کے پاس حکیم کی امانت ہے اور اگر حکیم کبھی واپس آ گیا تو اسے کیا منہ دکھائے گا۔ ادھر فیاض حکیم رام لعل کی جائیداد کی حفاظت کی جنگ لڑ رہا تھا جبکہ دوسری طرف قیام پاکستان کا اعلان ہو گیا مسلم ریاست ہونے کے ناتے بہاول پور ریاست میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور لوگوں نے جلوسوں کا اہتمام کیا۔ یہاں پر ناول اپنے عہد کی تاریخ کا روپ دھار لیتا ہے جہاں جابجا تاریخ ناول کے موقف کی تائید کرتی نظر آتی ہے۔ بہاول پور کے نامور مؤرخ مسعود حسین خان لکھتے ہیں:

> "ریاست میں قیام پاکستان پر خدا کا شکریہ ادا کیا گیا۔ فورٹ عباس سے لے کر صادق آباد تک جشن کا سماں تھا اور تمام سرکاری عمارتوں پر پاکستانی پرچم لہرا دیے گئے۔"(4)

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کا قیام عمل میں آیا تو ریاست کی عام فضا بھی پاکستان سے الحاق کے حق میں تھی لیکن نواب صاحب ان دنوں انگلستان تھے۔ اس کی وجہ سے ریاست کا کسی بھی ملک سے الحاق کا اعلان نہ کیا گیا۔ دوسری جانب ہندوستان اور پنڈت نہرو کی خواہش تھی کہ ریاست بہاول پور ہر قیمت پر ہندوستان سے الحاق کرے۔ اسی سلسلے میں پنڈت نہرو نے نواب صاحب سے لندن میں ملاقات کی۔ جب نواب صادق بہاول پور میں تھے تو پنڈت نہرو نے اپنی بہن وجے لکشمی پنڈت کے ذریعے نواب صادق کو پیغام بھجوایا کہ وہ اپنی مرضی کی شرطوں پر بھارت سے الحاق کریں:

> "دھچر! سنا ہے کہ نہرو اپنی بہن بھیج رہا ہے صادق سئیں کے پاس۔۔۔۔ کوئی لکشمی نہرو کی بہن دولہا سئیں کو راضی کرنے کے لیے آ رہی ہے۔"(5)

تاریخ بھی اس واقعے کی گواہ ہے۔ صاحب زادہ محمد قمرُالزمان عباسی اپنی کتاب "بہاول پور کا صادق دوست" میں اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> "وجے لکشمی پنڈت، جو نہرو کی بہن تھی، نے نواب صادق محمد خان عباسی سے صادق گڑھ پیلس میں ملاقات کی۔ اس ملاقات میں وجے لکشمی پنڈت نے نواب بہاول پور کو ایک تجویز پیش کی اور کہا کہ اگر نواب صاحب اپنی ریاست بہاول پور کو پاکستان کی بجائے ہندوستان میں شامل کر لیں تو ان کے ساتھ خصوصی معاہدہ کیا جا سکتا ہے۔"(6)

نواب صاحب نے وجے لکشمی کی تجویز کو مکمل طور پر قبول نہ کیا۔ صاحب زادہ قمر الزمان مزید لکھتے ہیں کہ جب نواب لندن گئے تو وہاں وجے لکشمی پنڈت نے دوبارہ ان تجاویز کو دہرایا اور کہا کہ ہم اس کے علاوہ بھی آپ کو مزید مراعات دینے کے لیے تیار ہیں۔ نواب صاحب نے انکار کرتے ہوئے انہیں دوٹوک جواب دیا۔

"Bahawalpur is a Muslim state and I will accede to Pakistan."(7)

فیاض حسین کی طرح تمام ریاستی آبادی نواب صاحب کی طرف دیکھ رہی تھی کہ وہ ریاست کے مستقبل کا فیصلہ کیا کرتے ہیں۔ بالآخر نواب صاحب نے ۱۳ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو پاکستان سے الحاق کے معاہدے پر دستخط کر دیے جسے ۵ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو پاکستان کے گورنر جنرل قائداعظم محمد علی جناح نے اپنے دستخط سے منظور و قبول کیا۔ ناول نگار نے بھی ناول میں یہی حقائق بیان کیے ہیں۔

"پاکستان بننے کے ڈیڑھ مہینے بعد اکتوبر میں نواب صادق محمد خان خامس عباسی نے ریاست کا انڈیا کی بجائے پاکستان کے ساتھ الحاق کا اعلان کر دیا۔"(8)

نواب آف بہاول پور صادق محمد خاں خامس نے قیام پاکستان کا خیر مقدم کیا اور اس کی بے پناہ معاونت بھی کی۔ مہاجر اور آبادکاروں کو ریاست میں آباد کرنے کے لیے نواب صاحب نے خصوصی فنڈ قائم کیے اور ان پر ریاستی وسائل کے دروازے کھول دیے۔ مسعود حسن شہاب دہلوی اپنی کتاب "بہاول پور کی سیاسی تاریخ" میں لکھتے ہیں:

"مہاجرین کی بحالی کے لیے 'وزارت بحالی مہاجرین' کے نام سے ایک نئی وزارت قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ چناں چہ ۱۵ جنوری ۱۹۴۸ء ریاست کی کابینہ میں توسیع کر کے مخدوم الملک غلام میراں شاہ کو وزارت بحالی مہاجرین کا عہدہ تفویض کر دیا گیا۔"(9)

مقامی لوگوں نے اس صورت حال کو اپنے مہاجر بھائیوں کی امداد سمجھنے کے بجائے اپنی حق تلفی پر محمول کیا گیا۔ تمام تر وسائل مہاجرین کے لیے میسر بنا دیے گئے، خاص طور پر اجناس کی منڈیاں۔ انھوں نے ہر اس دکان کو سنبھال لیا جہاں تھوڑی سی بھی خریداری کا امکان ہو سکتا تھا۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ سرکاری دفتروں میں مہاجرین کی پہنچ زیادہ ہوتی چلی گئی۔ ان کے تعلقات ہر اس مقام تک استوار ہونے لگے جہاں سے اختیار و اقتدار کے سوتے پھوٹتے تھے۔ حکومتی مہربانیوں اور سرکاری افسران کے دستِ شفقت کی بدولت مہاجرین نے پیداواری ذرائع سے خوب استفادہ کیا۔ ریاستی زمینیں بھی مہاجرین کو آلاٹ کر دی گئیں۔ نواب صاحب کو اپنے بدنیت اور خائن عمال سے یہی رپورٹ ملتی کہ ریاستی آبادی آلسی اور کام چور ہے۔ لہٰذا زمینیں مہاجرین کو آلاٹ کی جائیں کیوں کہ وہ محنتی بھی ہیں اور آبادکاری کے گُر بھی جانتے ہیں:

"نواب صاحب ان نئے لوگوں پر اتنا مہربان ہوا کہ زمینیں تو عطا کیں سو کیں، اسٹامپ پیپر کے آٹھ آنے بھی سرکاری خزانے سے ادا کرنے کا حکم دے دیا۔"(10)

اس صورتحال سے ریاستی آبادی شدید متاثر ہوئی اور مکمل طور پر مفلوج ہو کر رہ گئی۔ غربت، بھوک، افلاس اور احساس کمتری ان کا مقدر ٹھہرا اور اپنے گزرے کل کو یاد کر کے آنسو بہانے پر لگ گئی۔ ریاستی ملازموں کی بڑی تعداد ملازمتوں سے فارغ ہو کر گھر کی ہو رہی۔ واد ھو، دھچر، فیاض سمیت تمام لوگ اب سارا دن فارغ گزارتے جبکہ کام نہ ہونے کے برابر تھا۔ تمام تر ذرائع پیداوار پر مہاجرین قابض ہو گئے۔ وہ شہر جو پہلے بارونق ہوا کرتے تھے اب یوں لگتا تھا کہ کسی نحوست کی لپیٹ میں آ گئے ہیں۔ ریاستی آبادی اور مہاجرین کے درمیان شدید اختلاف کی فضا پیدا ہو گئی۔ ایک شہر، ایک جگہ اور ایک محلے میں رہنے کے باوجود بھی ان کے دل آپسی قربت کے دائرے میں نہیں آ سکے تھے۔ مقامی آبادی اور مہاجرین کے درمیان ایک عجیب سا کھچاؤ تھا:

"ہر آنے والے دن کے ساتھ ان دونوں طبقات میں دوری بڑھتی ہی چلی گئی، گھٹنے کی گنجائش ہی نہ رہی۔"(11)

"ادھ ادھورے لوگ" ناول کیا ہے؟ نوحہ ہے سرائیکی وسیب کا اور اس شناخت کا، جو مقتدرہ قوتوں کی ہوس کا نشانہ بن گئی۔ ریاست بہاول پور متحدہ ہندوستان کی دوسری بڑی خوشحال، پُرامن اور خود مختار ریاست ہونے کا درجہ رکھتی تھی۔ اس کی اپنی تاریخ، جغرافیہ، تہذیب و ثقافت، رہن سہن، زبان اور اپنا مزاج تھا۔ اس ریاست کی ثقافت اور شناخت پر پہلا حملہ اس وقت ہوا جب گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین نے ۱۹۳۵ کے گورنمنٹ ایکٹ آف انڈیا کے تحت بہاول پور کی ریاستی حیثیت کو ختم کر کے اسے صوبے کا درجہ دے دیا۔ ریاستی عوام جو پہلے ہی اپنی شناخت اور بقا کی جنگ لڑ رہی تھی ان کے لیے یہ فیصلہ ظلم بالا ظلم ثابت ہوا۔ یہ فیصلہ عوام اور نواب صاحب کی مرضی کے بر خلاف تھا۔ حالانکہ ریاست کی حیثیت کا تعین خود نواب اور اس کی عوام کرتی نا کہ کوئی اور۔

قیام پاکستان کے فوراً بعد جناح کی وفات پاکستان کے لیے ایک برا شگون ثابت ہوئی۔ جناح کے بعد کوئی ایسی مناسب قیادت میسر نہ تھی جو اس نوزائیدہ مملکت کو آکسیجن ماسک فراہم کرتی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وطن عزیز شدید سیاسی و انتظامی بحران میں مبتلا ہو گیا۔ حکومت کی باگ ڈور بیمار ذہنیت اور مفاد پرست لوگوں کے ہاتھ میں آ گئی۔ جس نے ملک اور جمہوری نظام کو نا قابلِ تلافی نقصان پہنچایا۔ انہوں نے پے در پے ایسے اقدامات اٹھائے اور قانون بنائے جن سے ان کی حکومت کا سکہ مزید کچھ عرصہ چل سکتا تھا۔ انھی میں سے ایک قانون ون یونٹ ایکٹ بھی تھا۔ ون یونٹ وہ منصوبہ تھا۔ جس کے تحت مغربی پاکستان کے تمام صوبوں (سرحد، پنجاب، بلوچستان، سندھ اور بہاول پور) کو ایک اکائی میں تبدیل کر دیا گیا جب کہ اس کا دوسرا حصہ مشرقی پاکستان تھا۔ اس طرح پاکستان محض دو صوبوں پر

مشتمل ایک ریاست بن گئی۔ون یونٹ بنانے کی تجویز محمد علی بوگرہ نے مسٹر غلام محمد کی ایما پر ۲۲ نومبر ۱۹۵۴ء کو پیش کی اور سرکاری طور پر یہ اعلامیہ جاری کیا گیا کہ اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے بعد صوبائی عصبیتیں دم توڑ دیں گی اور مختلف علاقوں کی عوام ایک دوسرے کے قریب آجائے گی اور اس طرح سے کروڑوں روپے کی رقم بھی بچ جائے گی جو یونٹوں کی وزارتوں پر خرچ کی جارہی تھی لیکن یہ مکمل سچ نہ تھا حقائق اس کے برعکس تھے۔یہ قانون غلام محمد نے صرف اپنے اقتدار کو طول دینے کے لیے بنایا جسے اکتوبر ۱۹۵۵ کو نافذ العمل کر دیا گیا:

"7 دسمبر ۱۹۵۴ء کو پاکستان کے نویں وزیر اعظم چوہدری محمد علی نے نواب بہاول پور کی گردن پر پاؤں دھرتے ہوئے بہاول پور کے صوبہ مغربی پاکستان میں شامل کئے جانے کے معاہدے پر دستخط کرا لیے۔"(12)

یہی نہیں بلکہ

"اس معاہدے کی رو سے پاکستان کی آئین ساز اسمبلی نے ۳۰ ستمبر ۱۹۵۵ء ویسٹ ایکٹ پاکستان منظور کر لیا۔جس پر عمل درآمد ۱۴ اکتوبر سے ہونا تھا۔"(13)

ناول میں بیان کردہ تاریخی حقائق کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ مسعود حسن شہاب دہلوی بھی اپنی کتاب "بہاول پور کی سیاسی تاریخ" میں لکھتے ہیں:

"بل دستور ساز اسمبلی میں پیش کیا گیا، منظوری کے بعد ۱۴ اکتوبر ۱۹۵۵ء کو گورنر جنرل کی توثیق کے بعد نافذ العمل ہو گیا۔"(14)

اس جبری شمولیت کے خلاف فیاض حسین کی مزاحمت اس عہد کے حالات کا پتا دیتی ہے جنھوں نے ظلم کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ون یونٹ کے خلاف "اینٹی ون یونٹ فرنٹ" تحریک چلی جس کے روحِ رواں عبدالغفار خان (صوبہ سرحد) تھے۔فیاض حسین سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اس تنظیم سے وابستہ ہو گیا۔وہ دن رات کام کرتا جلسوں کی صدارت کرتا لوگوں کو اپنے حقوق سے آگاہ کرتا رہتا۔اس جرم کی پاداش میں فیاض سمیت تمام اینٹی ون یونٹ تحریک کے کارکنوں کو گرفتار کر کے جیل میں بند کر دیا گیا۔ون یونٹ ایک ایسا قانون تھا جس کا سب سے زیادہ نقصان ریاست بہاول پور اور اس کی مقامی آبادی کو ہوا۔یہ ریاست کی ثقافت وشناخت پر سب سے بڑا حملہ تھا۔ون یونٹ ایکٹ نے بہاول پور کی آبادی پر بڑے گہرے اثرات مرتب کیے۔فیاض جو پہلے صرف اپنی شناخت کی تلاش میں سرگرداں تھا مگر اب تو پوری ریاست کی پہچان اور شناخت گرداب کی گردشوں کا لقمہ ہو چکی تھی۔ناول نگار لکھتے ہیں:

"ون یونٹ پاکستان کی سیاسی تاریخ کا سیاہ باب کہ جس کے سبب حکمران ذہنی ساخت نے بیک جنبش قلم محکوم لسانی ثقافتوں سے ان کی تمام تر تہذیبی، تاریخی اور جغرافیائی پہچان ساز

شناختیں چھین کر اپنی غاصبانہ تحویل میں لے لی۔ صدیوں سے اس خطے میں رہنے والے کروڑوں لوگ شب بھر اپنی شناخت کے بحران میں یوں مبتلا کیے گئے کہ زندہ رہنے کا ہنر تک بھلا بیٹھے۔"(15)

فیاض حسین ون یونٹ جیسے کالے قانون کے خلاف اپنی دھرتی کے تشخص کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دیتا ہے۔ فیاض کے دل میں اپنی دھرتی کی محبت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب وہ ون یونٹ کے خلاف مظاہروں میں گرفتار ہوا تو ۲ سال بعد چیف جیلر نے اس کو مغربی پاکستان کے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر (ایوب خان) کا پتا لکھوا کر دیا کہ اس پہ عرضی بھیجو تو رہا ہو جاؤ گے۔ لیکن فیاض یہ کہہ کر انکار کر دیتا ہے کہ:

"میں عرضی اس وقت دوں گا جب ایوب خان ون یونٹ توڑ کر میرے بہاول پور کو صوبہ بنانے کا اعلان کرے گا۔"(16)

اس طرح فیاض نے دس سال بغیر کسی جرم کے سزا کاٹی لیکن عرضی نہ لکھی۔ فیاض جانتا تھا کہ انسان کی اصل شناخت اس کی دھرتی ہے۔ جب یہ ہی اپنی نہ رہے تو انسان وقت کی گرداب میں گم ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے جب پولیس والے نے فیاض سے اپنا پتا پوچھا تو فیاض بتاتا ہے کہ:

"پہلے تو ریاستی تھا، اب ریاست چھن گئی تو پتا رہا اور نہ ہی نشان، نہ بستی نہ مکان۔"(17)

ایوب خان کا دور ختم ہوا اور جنرل یحیٰی نے اقتدار سنبھال لیا اسی دوران ون یونٹ ایکٹ کے ختم ہونے کی بات چل نکلی۔ تمام سیاسی جماعتوں اور تنظیموں نے ون یونٹ کو ختم کرنے کا مطالبہ کیا۔ یہ مطالبہ کچھ عرصے میں زور پکڑ گیا۔ فیاض سمیت ریاست کے سبھی قوم پرستوں کے دل میں صوبہ بہاول پور کی بحالی کی امید پیدا ہو گئی۔ اسی امید پر فیاض اپنا چلتا کام پھر سے چھوڑ کر اینٹی ون یونٹ تحریک سے وابستہ ہو گیا۔ اس کا خیال تھا کہ اب بہت جلد ون یونٹ ٹوٹ جائے گا اور بہاول پور صوبہ بحال ہو جائے گا۔ بالآخر وہ دن آ گیا جب ون یونٹ ایکٹ کو یحیٰی خاں نے ختم کر دیا لیکن سرائیکی عوام کے ساتھ مرکزی حکومت نے بہت بڑی ناانصافی کی۔ ون یونٹ ٹوٹا تو باقی چار صوبوں (سندھ، سرحد، پنجاب اور بلوچستان) کی صوبائی حیثیت بحال کرنے کا اعلان کیا گیا لیکن بہاول پور کی عوام کے ساتھ ظلم کرتے ہوئے بہاول پور کو پنجاب میں ضم کر دیا گیا۔

"بہاول پور کی وعدہ شدہ صوبائی حیثیت بحال کرنے کی بجائے اسے صوبہ پنجاب میں ضم کر دیا گیا۔"(18)

یہ لمحہ بہاول پور کی عوام کے لیے انتہائی کرب اور دکھ کا لمحہ تھا۔ یہ ناانصافی کے ساتھ ساتھ اس وعدے کی خلاف ورزی بھی تھی جو ۱۹۵۵ء میں حکومت نے ون یونٹ کے قیام وقت نواب صاحب کے ساتھ کیا کہ جب ون

یونٹ ایکٹ ختم ہو گا تو بہاول پور کی صوبائی حیثیت پھر سے بحال کی جائے گی۔ فیاض اور فیاض جیسے کئی نوجوان اس امید پر جی رہے تھے کہ آخر ایک دن ون یونٹ ایکٹ ختم ہو گا اور صوبہ بہاول پور پھر سے بحال ہو جائے گا لیکن اب وہ امید بھی باقی نہ رہی:

> "فیاض جیسے قوم پرستوں کے لیے ون یونٹ کا اس طرح ٹوٹنا، ون یونٹ بننے سے کہیں زیادہ تکلیف دہ تھا۔ ون یونٹ بننے کے بعد اُس کے ٹوٹنے کی کوشش میں اگرچہ ریاستوں کی ایک نسل دنیا سے گزر گئی مگر ایک آس تو تھی کہ یہ طوق کبھی ٹوٹ کر رہے گا مگر ہمہ وقت شراب کے نشے میں مدہوش حاکم سے ایسا کاری وار کرا لیا گیا کہ جس کے بعد وہ آس بھی ختم ہو کر رہ گئی۔"(19)

ون یونٹ ٹوٹنے سے پہلے سندھی، بلوچی، پشتون، بنگالی، بھی بہاول پور کے ریاستیوں کے دُکھ کو سانجھا سمجھتے تھے مگر اب پاکستان کی پوری وحدت میں ان کے آنسو پونچھنے والا کوئی نہ رہا۔ ان حالات میں ریاستی آبادی نے اپنی جنگ آپ ہی لڑنے کا سوچا۔ چنانچہ فیاض اور اس جیسے کئی قوم پرستوں نے اپنے حق اور آزادی کے لیے علمِ بغاوت بلند کیا۔ صادق آباد سے لے کر فورٹ عباس تک تمام ریاستی عوام "بہاول پور متحد محاذ" کی قیادت میں ایک ہو گئی۔ جس کی سربراہی شہزادہ مامون الرشید کر رہے تھے اور یہ طے پایا کہ ۲۴ اپریل ۱۹۷۰ء کو فرید دروازے کے سامنے تمام ریاستی آبادی احتجاج کے لیے اکٹھی ہو گی۔ حکومت نے اس احتجاج کو روکانے کی سخت کوشش کی۔ جگہ جگہ پولیس اور رینجرز کے سپاہی تعینات کر دیے گئے تاکہ لوگوں کو احتجاج میں شرکت کرنے سے روکا جائے لیکن تمام تر مصیبتوں اور رکاوٹوں کے باوجود لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد فرید دروازے پر پہنچی۔ اس جلوس میں مردوں کے علاوہ خواتین کی ایک بڑی تعداد بھی شامل تھی۔ جب حکمرانوں کو لگا کہ یہ معاملہ دبنے والا نہیں تو انھوں نے پہلے لاٹھی چارج اور آنسو گیس کا حکم دیا، بعد میں ان نہتوں پر سیدھے فائر کھول دیئے گئے:

> "لوگوں نے چیخنا چلانا شروع کیا کہ پولیس نے بلا محابہ آنسو گیس چلانا شروع کر دی ہے۔۔۔ پولیس نے اتنی بڑی تعداد میں خلقت کو اپنی طرف آتے دیکھا تو ایک دم ان پر سیدھا فائر کھول دیا۔ اس کے بعد کیا ہوا، کتنے مرے اور کتنے زخمی ہوئے، کون گنتا اور کس کے لیے گنتا؟ ساٹھ ستر ہزار لوگوں پر کتنی دیر اندھا دھند گولی چلی مگر سرکاری اعلان صرف دو لوگوں کے مرنے کا ہوا۔"(20)

ان معصوم لوگوں کا قصور صرف اپنے حقوق کا مطالبہ تھا۔ناول نگار کے مطابق ۲۵ اپریل کی صبح کو قلعہ ڈیر کے قریب لاشوں سے بھرے ٹرک بر آمد ہوئے۔ان لاشوں کو ریت کے ٹیلوں میں دفن کر دیا گیا۔سب سے پہلی لاش جو ٹرک سے نیچے اتاری گئی وہ تمام عمر اپنی تلاش میں سر گرداں رہنے والے فیاض کی تھی:

"25اپریل ۱۹۷۰ء صبح سویرے سورج نکلنے سے پہلے قلعہ ڈیر اور سے کئی میل آگے ریت کے ٹیلوں کے درمیاں ایک پرانا ٹرک کھڑا تھا۔۔۔۔کچھ دیر کے بعد تھانیدار کی وردی میں ملبوس افسر نے ان ٹیلوں کے درمیان قدرتی طور پر بنی ہوئی پیالہ نما جگہ کو کچھ کھودنے کا اشارہ کیا تاکہ کل فرید دروازے پر کی جانے والی فائرنگ کے مقتول ریاستیوں کو آج کا سورج ابھرنے سے پہلے گمنام تدفین کی نذر کر دیا جائے۔۔۔کھدائی ابھی ایک ایک فٹ بھی نہ ہوئی تھی کہ اندر سے پرانے سوکھے ہوئے انسانی ڈھانچے ظاہر ہونے لگے۔مزدور ڈر کر ادھر اُدھر ہونے لگے تو تھکاوٹ سے ادھ مرا ہوا تھانیدار بھی ہنس دیا۔کھودو کھودو بہن بھنکو۔۔۔یہ تو بنی بنائی قبر ہے۔یہیں دفن کرتے ہیں ان بہن تڑیکوں کو۔۔۔مزدوروں نے بھی مزید کھدائی کیے بغیر ٹرک میں سے لاشیں نیچے گھسیٹنی شروع کر دیں اور اتنی ہی تیزی سے ایک ایک کر کے گڑھے میں ڈالنے لگے۔سب سے پہلی لاش تمام عمر اپنی شناخت کی تلاش میں سر گرداں رہنے والے فیاض کی تھی۔"(21)

اس حکومتی رویے کو جس طرح ناول نگار نے بیان کیا ہے تاریخ کی کتابوں میں بھی وہی حقائق ملتے ہیں جس سے ناول نگار کے بیانیے کو تقویت ملتی ہے۔مسعود حسن شہاب دہلوی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

"بہاول پور کی تاریخ میں ۲۴ اپریل ۱۹۷۰ء کا دن بڑا خون آشام تھا۔انجمن داؤد گان کا جلوس فرید گیٹ پہنچ گیا تھا۔اس پر پولیس نے لاٹھی چارج کر دیا۔پھر آنسو گیس بموں کے دھماکے ہونے لگے۔ایک بم عین اسٹیج پر گرا،خواتین کا ہجوم اسٹیج کے ہی گرد تھا۔ان میں بھگدڑ مچ گئی۔۔۔۔وہ سنبھلنے نہ پائے تھے کہ بندوق کی گولیوں کی سنسناہٹ سنائی دی۔اس کے بعد گولیاں چلتی رہیں۔"(22)

اپنی اور ریاست کی شناخت کا متلاشی فیاض آخر کار اس مٹی میں مل گیا جس مٹی کا خمیر تھا۔اس طرح ناول اپنے اختتام کو پہنچتا ہے۔اردو ادب کی تاریخ میں اس بڑے سانحے پر کبھی کسی نے نہیں لکھا۔اگر لکھا بھی ہے تو نہ لکھنے کے برابر ہے۔اس اعتبار سے اس واقعہ پر لکھا جانے والا پہلا ناول "ادھ ادھورے لوگ" ہے۔

ناول کا ایک اہم کردار تلسی ہے جس کی موجودگی نے ناول کو تاریخ بننے سے بچایا ہے۔اس کردار کو ناول میں ہیروئن کا درجہ حاصل ہے۔تلسی بیس اکیس سال کی نہایت خوبصورت لڑکی ہے جو اپنے والد حکیم رام لعل کی

اکلوتی اولاد ہے جس کی منگنی اپنے خالو سوڈھی مل کے بیٹے وشنو سے طے پاتی ہے جو پرلے درجے کا نکما اور بے وقوف ہے۔ تلسی کو جہاں ایک طرف اپنی والدہ اور سوڈھی مل کے تعلق کا علم ہے وہیں اسے دوسری طرف یہ بھی پتا ہے کہ سوڈھی مل اسے کس نیت سے دیکھتا ہے۔ وہ یہ جانتی ہے کہ اس کی شادی بھلے وشنو سے ہو گی لیکن وہ سوڈھی مل سے نہیں بچ پائے گی۔ سوڈھی مل جب تلسی کو دیکھتا تو تلسی کو یوں لگتا کہ جیسے وہ کہہ رہا ہے کہ:

"تو کہاں جائے گی تلسی! میرے ماپ اور بیچے کی رن صرف تمھاری ماں ہی نہیں اب اگلی باری تمھاری ہو گی۔" (23)

دوسری طرف تلسی نے فیاض کو اور فیاض نے تلسی کو جب پہلی بار دیکھا تو دونوں ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو گئے۔ دونوں یہ بات جاننے کے باوجود کہ وہ کبھی ایک نہیں ہو سکتے ایک دوسرے کا دم بھرنے لگے۔ تلسی کے کردار میں محبت اور اس کے اظہار کی میراث ہے۔ تلسی کی محبت میں خلوص بھی ہے ، معصومیت اور جرات بھی۔ جب تلسی اور اس کا پورا خاندان (تلسی کی ماں رادھی، خالو سوڈھی مل، منگیتر وشنو، اور والد حکیم رام لعل) بہاول پور سے ہجرت کر کے بھارت جانے لگے (جو ان کا آخری سفر ثابت ہوا) تو تلسی ہر انجام سے ماورا ہو کر سب کے سامنے فیاض سے لپٹ جاتی ہے:

"تلسی فیاض کے قریب آئی اور اس کے دائیں ہاتھ کی انگلیاں اپنی انگلیوں میں پھنسانے کے بعد اس کے سامنے کھڑی رہی۔۔۔۔۔۔فیاض کی نگاہ اس کی گردن میں جھولتی سرخ رنگ کے موٹے موتیوں کی مالا پر جا ٹکی۔"(24)

تلسی نے فیاض کے ساتھ اپنی انگلیاں ایسے ملائیں کہ پھر آخر تک کوئی جدا نہ کر سکا اور وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایک ہو گئے:

"فیاض کی لاش کو اٹھا کر پھینکا گیا تو وہ ایک نسوانی ڈھانچے کے ساتھ جڑ کر جا گری جس کے گلے میں بڑے بڑے سرخ موتیوں کی دوہری مالا دور سے بھی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ دونوں کی دائیں ہاتھ کی انگلیاں اس طرح ایک دوسرے سے چپٹی ہوئی تھیں جیسے ایک دوسرے کی تکریم کر رہی ہوں۔"(25)

ناول کی سب سے بڑی خوبی مذہب، زبان اور زر جیسے دائروں کی بجائے انسانی ذات کی تکمیل اور شناخت کو ارادی سطح پر انسانیت سے وابستہ کیا جانا ہے۔ ناول نگار نے فیاض کو اس وقت تلسی سے ملوایا جب وہ دونوں مذہب، اخلاق، زبان اور زمین جیسے دائروں سے آزاد ہو چکے تھے۔

ناول کا ایک اور اہم کردار مہراں ہے جس نے مردانہ سماج کے رویوں اور پیری مریدی اور خانقاہی کلچر کو بے نقاب کیا ہے۔ مہراں ایک خوب صورت اور جوان عورت ہے۔ مہراں وادھو کی بیوی ہے جو اپنے جنسی حق سے محروم رہتی ہے۔ سارا جسمانی قصور وادھو کا ہونے کے باوجود وادھو اسے بانجھ ہونے کا طعنے دیتا ہے۔ وہ اپنا علاج کروانے کی بجائے مہراں کو مار کر اور گالیاں دے کر اپنی مردانگی ظاہر کرتا ہے۔ آئے روز وادھو کا مہراں کے ساتھ یہی سلوک ہوتا ہے۔ آخر ایک عورت کب تک اپنی یونہی تذلیل برداشت کرتی۔ مہراں نے وادھو اور اس معاشرے سے بڑا سخت انتقام لیا۔ وہ اپنی تکمیل اور جنسی آسودگی کے لیے مڑیچی والے بھوپے کے پاس جاتی ہے۔ مڑیچی والے بھوپے (جعلی پیر) کے جنسی عمل سے مہراں کو اولاد تو ہوتی ہے لیکن یہ اولاد کئی معاشرتی سوالات کو بھی جنم دیتی ہے جن کے جوابات شاید معاشرے کے اس طبقے کے پاس بھی نہیں جن کا ماننا ہے کہ عورت کا سسرال کے گھر سے جنازہ ہی اٹھنا چاہیے۔ مہراں اور تلسی کا کردار ان تمام لڑکیوں کی نمائندگی کرتا ہے جو ایک گھٹن زدہ معاشرے میں جنم لیتی ہیں، انھیں کسی فیصلے کا کوئی حق حاصل نہیں ہوتا۔ ان کی حیثیت محض ایک زر خرید غلام کی سی ہے جسے جب چاہا جس کے ساتھ چاہا تاعمر منسوب کر دیا۔ ناول نگار لکھتے ہیں:

> "ہمارے وسیب کی دوشیزائیں بھی کیسا نصیب لے کر آنکھ کھولتی ہیں جہاں شعور کی پہلی دید کے ساتھ ہی اپنی زندگی آپ جینے کی بجائے ایک ایسی جونک ہونے کا یقین دلا دیا جاتا ہے کہ جس کا مقدر ایک مرد کے وجود کے ساتھ جڑے رہنے کے سوا کچھ بھی نہیں۔"(26)

ناول نگار نے اپنے ناول میں شاید اس بات کا ازالہ کرنے کے لیے خواتین کو مردوں سے زیادہ بے باک اور نڈر دکھایا ہے۔ اس ناول میں حفیظ خان نے طبقاتی کشمکش کو بھی موضوع بنایا ہے یعنی ایک طرف تو وہ طبقہ (سلمٰی بدرالدین جیسے کردار) ہے جو دولت کے انبار اور اثاثوں کے لامتناہی اضافے کی اندھی دوڑ میں انسانی احساس اور تہذیب کو روندتا چلا جاتا ہے۔ دوسری طرف وہ محنت کش طبقہ (وادھو، دھچھر اور فیاض جیسے کردار) ہے جو سماجی جمود کے عام حالات میں حکمرانوں کی ثقافت، سماجی اقدار، اخلاقیات، ریت رواجوں اور توہمات کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ ریاستی اور معاشرتی جبر میں دبا ہوا اس مخصوص کیفیت میں یہ طبقہ نحیف ولاچار دکھائی دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سرمایہ دار طبقہ ان کا ہر طرح سے استحصال کرتا ہے۔ بیگم سلمٰی بدرالدین ایک امیر کبیر عورت ہے جو فیاض کو جیل سے رہا کروانے کے بعد اسے جسمانی تعلقات پر مجبور کرتی ہے۔ فیاض جب اس سے راہ فرار اختیار کرتا ہے تو دوبارہ اس کی پکڑ میں آجاتا ہے۔ فیاض دل میں سلمٰی بدرالدین کے خلاف سخت کڑھتا ہے اور اس سے شدید نفرت کرتا ہے۔ جب سلمٰی بدرالدین اپنی خواہش کی تسکین کے لیے فیاض کے قریب آتی ہے تو وہ دل ہی دل میں جل بھُن رہا ہوتا ہے:

"فیاض کا دل چاہا کہ وہ اسے دھکیل کر ایک طرف پھینکے اور چیخ چیخ کر بتادے کہ وہ چندری اور گھٹیا عورت خود اس کے لائق نہیں۔"(27)

جب سلمٰی بدرالدین فیاض سے اپنی خواہش کی تسکین حاصل نہ کر سکی تو وہ فیاض کے منھ پر تھوک کر چلی جاتی ہے۔اس کے رد عمل میں فیاض بے بس ہو کر کھڑا رہا،نہ مزاحمت کی اور نہ ہی کوئی احتجاج کیوں کہ وہ ایک ایسے طبقے(نچلے) سے تھا جو ظلم اور زیادتیوں پر صرف آنسو بہانے اور برداشت کرنے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتا لیکن یہاں فیاض کا انکار سرمایہ دارانہ سوچ پر ایک کڑا چابک ہے جو ہر جذبے اور رشتے کو بکاؤ سمجھتا ہے۔

ناول نگار نے حقیقت پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس عہد کی سماجی مشکلات، مسائل اور حالات وواقعات کا کھل کر ذکر کیا ہے۔ناول نگار نے معاشرے کے ان ناسوروں کو کھل کر تنقید کا نشانہ بنایا جو ہمہ وقت دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنے کے لیے تیار بیٹھے ہوتے ہیں۔ناول میں دکھایا گیا ہے کہ جو جائیداد حکیم رام لعل نے فیاض کے نام کی اس پر وادھو، احمد شاہ، پیری بدمعاش اور فیاض کے چچا جیسے لوگ اپنا حق سمجھتے ہوئے فیاض پر چڑھائی کر دیتے ہیں۔ ناول نگار نے امام مسجد جیسے مذہب کے ان نام نہاد علمبرداروں کے منافقانہ چہروں کو بھی بے نقاب کیا ہے جو اپنے مفاد کی خاطر دین فروشی کرتے ہیں۔جب امام مسجد کے حکیم کی دکان پر قبضہ کرنے کے تمام حربے ناکام ہو گئے تو پنچایتیوں نے یہ فیصلہ صادر کروایا کہ فیاض دکان مسجد کے نام لگوادے، اس کے کون سے باپ کی ہے لیکن فیاض نہ مانا۔ مذہبی علما کو فیاض کی یہ گستاخی اتنی سخت ناگوار گزری اور اس کے خلاف ہر نماز کے بعد تبرا(لعن طعن کرنا) شروع کر دیا۔(28)

اس سب کے ساتھ ساتھ ناول نگار نے ان سماجی اقدار کا پردہ بھی چاک کیا ہے جو توہم پرستی کے زمرے میں شمار ہوتی ہیں(تڈی وٹائی اور جن کھیلنے والی رسمیں)۔ مرد وعورت کی نفسیاتی پیچیدگیوں کو بھی بیان کیا ہے۔ تلسی اپنے رشتہ دار سے منگنی کے باوجود فیاض سے اپنی تکمیل چاہتی ہے۔مہراں بھی شادی شدہ ہونے کے باوجود اپنا بچہ پہلے فیاض سے(پھر اس کے انکار کے بعد) ایک جعلی پیر سے تعلق کے ذریعے پیدا کرتی ہے۔رادھی اپنے خاوند کے ہونے باوجود سوڈھی مل سے روابط استوار رکھتی ہے اور یہی معاملہ سلمٰی بدرالدین کے ہاں بھی دکھائی دیتا ہے۔

حفیظ خان نے ناول ''ادھ ادھورے لوگ'' میں بیانیہ انداز اپنایا ہے ۔ بیانیہ انداز میں معیاری زبان کا استعمال ہونا ضروری ہے۔ معیاری زبان سے مراد ایسی زبان جو روزمرہ، محاورہ اور زبان کے قواعد وضوابط کی پابند ہو۔ عام طور پر وہ ناول فنی لحاظ سے پختہ جانا جاتا ہے جس میں واقعاتی تنظیم کے ساتھ ساتھ زبان کی باریکیوں، نزاکتوں اور لسانی ندرتوں کا خیال رکھا گیا ہو۔ ناول ''ادھ ادھورے لوگ''میں خاص بات یہ ہے کہ اس کے اسلوب میں سرائیکی زبان کی بڑی عمدہ آمیزش ہے۔ حفیظ خان نے سرائیکی الفاظ کو اتنی مہارت سے اُردو میں برتا ہے کہ وہ خود اُردو کا حصہ بن گئے ہیں اور معنی کی ایسی پرتیں کھولی ہیں جن کو بیان کرنا مشکل ہے۔ یہ حفیظ خان کی تکنیکی ہنرمندی کا ثبوت ہے۔

ناول ''ادھ ادھورے لوگ'' میں کچھ فنی خامیاں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ اس میں سب سے پہلے تو فیاض کا کردار غیر فطری سا محسوس ہوتا ہے کیوں کہ کردار ہمیشہ خوبیوں اور خامیوں کا مجموعہ ہوتے ہیں لیکن فیاض کے کردار میں صرف خوبیاں ہی دیکھنے کو ملتی ہیں اور اس کردار کی جنسی بیزاری بھی کئی سوالات کو جنم دیتی ہے۔ناول کے تمام نسوانی کردار جنسی خواہش میں ڈوبے ہوئے نظر آتے ہیں جب کہ مردانہ کرداروں میں سوائے سوڈھی مل کے باقی تمام جنس سے بیزار نظر آتے ہیں لیکن یہ اتنی معمولی خامیاں ہیں کہ جس سے ناول کے مرتبے پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ خدا نے تخلیق کار کو اتنی صلاحیت دی ہے کہ وہ اسے بروئے کار لاتے ہوئے صدیوں پرانی دفن شدہ تہذیبوں کو ایک پل میں زندہ کر دیتا ہے۔ حفیظ خان سے بھی فطرت نے یہی کام لیا ہے انھوں نے صدیوں پرانی ریاست اور اس کی تہذیب اور تاریخ کو اپنے ناول کے ذریعے دوبارہ زندہ کر دیا ہے اور اپنے تئیں اپنے وسیب کی عوام کے دکھوں کا مداوا کیا ہے۔ حفیظ خان کا یہ ناول بہاول پور کی سرائیکی عوام کی محرومیوں کا ترجمان ہے جو اپنی ریاستی شناخت کے ختم ہونے پر آج بھی نوحہ کناں ہیں۔

حواشی و حوالہ جات

1۔ حفیظ خان، ادھ ادھورے لوگ، ملتان: انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اینڈ ریسرچ، 2010ء، ص 2۔

2۔ محمد طاہر، ڈاکٹر، ریاست بہاول پور کا نظمِ مملکت، ملتان: بزم ثقافت، 2010ء، ص 106۔

3۔ محمد طاہر، ڈاکٹر، ریاست بہاول پور کا نظمِ مملکت، ص 109۔

4۔ شہاب دہلوی اور مسعود حسن، بہاول پور کی سیاسی تاریخ، بہاول پور: مکتبہِ الہام، 1977ء، ص138۔

5۔ حفیظ خان، ادھ ادھورے لوگ، ص 110۔

6۔ محمد قمر الزمان عباسی، بہاول پور کا صادق دوست، لاہور: صاحبزادہ قمر عباسی، 1992ء، ص30-31۔

7۔ محمد قمر الزمان عباسی، بہاول پور کا صادق دوست، ص 30۔

8۔ ایضاً، ص 144۔

9۔ شہاب دہلوی اور مسعود حسن، بہاول پور کی سیاسی تاریخ، ص 153۔

10۔ حفیظ خان، ادھ ادھورے لوگ، ص 150۔

11۔ ایضاً، ص 161۔

12۔ ایضاً، ص 151۔

13۔ ایضاً، ص 151۔

14۔ شہاب دہلوی اور مسعود حسن، بہاول پور کی سیاسی تاریخ، ص 344۔

15۔ حفیظ خان، ادھ ادھورے لوگ، ص 1۔

16۔ ایضاً، ص 159۔

17۔ ایضاً، ص 192۔

18۔ ایضاً، ص 214۔

19۔ ایضاً، ص 214۔

20۔ ایضاً، ص 229۔

21۔ ایضاً، ص 230-231۔

22۔ شہاب دہلوی اور مسعود حسن، بہاول پور کی سیاسی تاریخ، ص423۔

23۔ حفیظ خان، ادھ ادھورے لوگ، ص 50۔

24۔ ایضاً، ص 133-134۔

25۔ ایضاً، ص 231۔

26۔ ایضاً، ص 86۔

27۔ ایضاً، ص 222۔

28۔ ایضاً، ص 143۔

References in Roman Script:

1. Hafeez khan, Adhooray Log, Multan: Institute of Policy and Research, 2010, P2.
2. M.Tahir, Dr, Riyasat Bahawalpur ka Nazm-i Mumlikat, Multan: Bazm-i Saqafat, 2010, P106.
3. M.Tahir, Dr, Riyasat Bahawalpur ka Nazm-i Mumlikat, P109.
4. Shahab Delhavi and Masood Hassan, Bahawalpur ki Siyasi Tarikh, Bahawalpur: Maktaba-i Ilham, 1977, P138.
5. Hafeez khan, Adhury Log, P110.
6. M. Qamar-ul Zaman Abbasi, Bahawalpur ka Saqiq Daust, Lahore: Sahibzada Qamar Abbasi, 1992, P30-31.
7. M. Qamar-ul Zaman Abbasi, Bahawalpur ka Saqiq Daust, P30.
8. As Above, P114.
9. Shahab Delhavi and Masood Hassan, Bahawalpur ki Siyasi Tarikh, P153.
10. Hafeez khan, Adhury Log, P150.
11. As Above, P161.
12. As Above, P151.
13. As Above, P151.
14. Shahab Delhavi and Masood Hassan, Bahawalpur ki Siyasi Tarikh, P344.
15. Hafeez khan, Adhury Log, P1.
16. As Above, 159.

17. As Above, 192.
18. As Above, 214.
19. As Above, 214.
20. As Above, 229.
21. As Above, 230-231.
22. Shahab Delhavi and Masood Hassan, Bahawalpur ki Siyasi Tarikh, P423.
23. Hafeez khan, Adhury Log, P50.
24. As Above, P133-134.
25. As Above, P231.
26. As Above, P86.
27. As Above, P222.
28. As Above, P143.